Dr. Syed Sheraz Ali Zaidi
Assistant Professor, Incharge,
Dept. of Iqbaliat, Allama Iqbal Open University, Islamabad

ڈاکٹر سید شیراز علی زیدی
اسسٹنٹ پروفیسر، انچارج، شعبہ اقبالیات،
علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

ابواللیث صدیقی کے ادبی اداریے: تحقیقی مطالعہ

Literary Editorials of Abul Lais Siddiqui: A research Study

Abstract: Dr. Abul Lais Siddiqui was also a literary journalist. During his life at Aligarh University when he was M.A Urdu Student from 1937 to 1938, he also served as the editor of famous Urdu journal "Aligarh Magazine". His leadership includes two important issues the magazine, Iqbal number and Aligarh number. Iqbal number was published on 1st April 1938, and it was the second Iqbal number published in Iqbal's life. In 1977 when Abul Lais was associated with Urdu Dictionary Board Karachi, as secretary and editor, in April 1977, 54th issue of the Board's research magazine" Urdu Nama" was also published under his editorship. In it he wrote a comprehensive editorial, titled "Quaid e Azam", regarding Qaid e Azam and Pakistan movement. But his greatest achievement as a literary journalist was the publication of monthly "Tehzeeb" Karachi, from the plat form of Aligarh Old boys' association. He took over its responsibilities as editor and his editorials continued to be published in the magazine till his death in September 1994. These editorial of Lais Sahab is not just literary pieces of a literary personality but they contain important information about Pakistan movement, Sir Syed movement, history, Politics, culture, society, education and the role of leaders of scholars. There are memories related to Aligarh and important notes on literature and poets of Urdu. This article consists of a research study of Dr. Abul Lais Siddiqui's literary editorials published in monthly "Tehzeeb", Karachi.

Key Words: Editor, Editorials, Tehzeeb, Satirical, Hilarious.

معروف محقق، نقاد اور ماہرِ لسانیات ڈاکٹر ابوالا بواللیث صدیقی ادبی صحافت سے بھی وابستہ تھے اور یہ دلچسپی ان کے، علی گڑھ یونیورسٹی میں تعلیمی دور سے دیکھی جاسکتی ہے۔ انھوں نے ۱۹۳۷ء اور ۱۹۸۳ء کے دوران جب وہ ایم اے اردو کے طالب علم تھے، علی گڑھ میگزین کے چار شمارے

بحیثیت طالب علم مدیر شائع کیے تھے۔ان کی ادارت میں شائع ہونے والے شماروں میں "اقبال نمبر" اور "علی گڑھ نمبر" اپنے دور کے اہم شمارے ہیں۔اقبال نمبر یکم اپریل ۱۹۸۳ء میں شائع ہوا۔ہندوستان میں یہ دوسرا اقبال نمبر تھا جو اقبال کی زندگی میں مرتب کیا گیا۔اس کے بعد ۱۹۷۷ء میں جب وہ مدیر اور معتمد کے طور پر اردو لغت بورڈ کراچی سے وابستہ ہوئے تو اپریل ۱۹۷۷ء میں بورڈ کے تحقیقی مجلے "اردو نامہ" کا ۵۴واں شمارہ انھوں نے شائع کیا اور اس میں "قائدِ اعظم" کے عنوان سے تحریکِ پاکستان اور قائدِ اعظم محمد علی جناح کی خدمات پر ایک جامع اور معلوماتی اداریہ تحریر کیا۔تاہم اس مجلے میں ان کا یہ ابتدائیہ پہلا اور آخری ثابت ہوا کیوں کہ بعض وجوہات کی بنا پر یہ مجلہ جاری نہ رہ سکا۔بعد ازاں ۱۹۳۸ء میں علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے ماہ نامے "تہذیب"، کراچی کا اجرا ابواللیث صاحب ہی کی مساعی سے ہوا اور انھوں نے مدیر کے طور پر اس کی ذمے داریاں بھی سنبھالیں تو ان کے اداریے ہر ماہ شائع ہونے لگے اور ان کی وفات ستمبر ۱۹۹۴ء تک شائع ہوتے رہے۔

ابواللیث صاحب کے یہ اداریے ایک ادبی شخصیت کے محض تبرکات ہی نہیں بل کہ ان میں تحریکِ پاکستان اور تحریکِ سرسید کے بارے میں اہم معلومات، تاریخ، سیاست، تہذیب و معاشرت، تعلیم و تعلم اور علما و زعما کے کردار پر بے لاگ تبصرے، ادبی تنقید اور اد باو شعرا سے متعلق اہم یادا شتیں موجود ہیں۔ یہ تحریریں تحقیق کے علاوہ ایک بالغ نظر شخص کے مشاہدات کی رو سے معاشرتی قدروں اور روایات کے جائزے میں بھی معاون ثابت ہو سکتی ہیں۔ یہ مجلہ سرسید کے "تہذیب الاخلاق" کی طرز پر نکالا گیا تھا اس لیے اس کا بنیادی مقصد نوجوان نسل کی اصلاح تھا۔ابواللیث صاحب کے اداریوں میں یہ پہلو خاص طور پر نمایاں ہے۔ان اداریوں میں ابواللیث صاحب ایک بے باک معاشرتی نقاد کے طور پر سامنے آئے ہیں اور ایک ادیب کی حیثیت سے ان کا وہ اسلوبِ نگارش بھی کھل کر سامنے آیا ہے جس کا بوجھ عام طور پر تحقیقی تحریروں کے لیے اٹھانا ممکن نہیں ہوتا۔ یہ اداریے زیادہ تر دو یا تین صفحات پر مشتمل ہیں تاہم بسا اوقات سمٹ کر ایک صفحے تک بھی محدود ہو گئے ہیں اور کبھی کوئی تینتیس صفحات پر بھی پھیل گیا ہے۔ طویل اداریوں کی مثال نومبر دسمبر ۱۹۸۵ء کا اداریہ ہے جو علامہ اقبال کی فکر اور تعلیمات کے بارے میں ہے۔

ابواللیث صاحب کے اداریوں میں کبھی مقالے کی سی بھرپور علمیت کا اظہار ملتا ہے اور کبھی انشائیے کا سا لطف محسوس ہوتا ہے۔اس اعتبار سے یہ اپنی نوعیت کے واحد اداریے ہیں۔ابواللیث صاحب کے یہ اداریے ماہ نامہ "تہذیب" کراچی، کی ۱۹۸۳ء سے ۱۹۴۴ء تک کی فائلوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔اس سے قبل ان کی خود نوشت "رفت و بود" بھی روزنامہ "جسارت"، کراچی کی ۱۹۸۰ء سے ۱۹۸۱ء اور "تہذیب" کی فائلوں میں دبی ہوئی تھی جسے جامعہ کراچی کی ایک طالبہ نے ۲۰۰۷ء میں ایم اے اردو کے مقالے کے لیے یک جا کیا تھا۔(I) اس کے بعد ڈاکٹر معین الدین عقیل نے ۲۰۱۱ء میں اس خود نوشت کو شائع بھی کر دیا۔ معلوم نہیں ان اداریوں پر اب تک تحقیقی کام ہو سکا ہے یا نہیں۔اگر نہیں ہوا تو ایم اے یا ایم فل کی سطح پر ان کو مرتب کروایا جا سکتا ہے تاکہ یہ ادبی تحریریں ایک نسخے کی صورت میں جمع ہو کر محفوظ ہو جائیں اور ضرورت کے وقت طلبا کو با آسانی دستیاب ہو سکیں۔ اس کام کا سب سے پہلا حق جامعہ کراچی کا ہے کیوں کہ ابواللیث صاحب نے اپنی زندگی کا ایک طویل حصہ جامعہ کراچی کے لیے وقف کیا تھا اور کراچی میں "تہذیب" کی فائلوں تک رسائی نسبتاً آسان ہے۔اگرچہ کسی ایک جگہ تمام شمارے شاید "تہذیب" کے دفتر میں بھی نہ مل سکیں مگر اس کے ساتھ

جامعہ کراچی کی محمود حسین لائبریری، سرسید یونیورسٹی، کی لائبریری، غالب لائبریری ناظم آباد اور بیدل لائبریری شرف آباد میں چھان بین کی جائے تو ۱۹۹۴ء تک کی مکمل فائلیں دریافت کی جاسکتی ہیں۔ درج ذیل سطور میں ان اداریوں کا تحقیقی اور تجزیاتی مطالعہ پیش کیا جارہا ہے تاکہ ان کی اہمیت واضح ہوسکے۔

ماہ نامہ "تہذیب" کی اولین اشاعت جون/۱۹۸۳ء سے ابواللیث صاحب کے ان ادبی اداریوں کا آغاز ہوتا ہے جنھیں وہ "ابتدائیہ" کے عنوان سے تحریر کرتے تھے۔ پہلے ابتدائیے ہی سے انھوں نے تحریک سرسید کی تفسیر اور ترویج واشاعت کا کام شروع کر دیا تھا تاکہ نوجوان نسل میں اسلامی تہذیب کے تحفظ کا جذبہ اور ملی بصیرت پیدا ہوسکے۔ اس نظر سے دیکھا جائے تو ان کے بہت سے اداریے ایسے بھی ہیں جو علی گڑھ تحریک کے حوالے سے نصابی مضامین کے درجے میں داخل ہوجاتے ہیں۔ پہلے ہی اداریے کے درج ذیل اقتباس سے اس کے مضمون کی کیفیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

> "اس وقت جسے یورپ کی جہالت کا دورِ تاریکی کہتے ہیں، اسلامی تعلیمی اداروں میں علوم وفنون کی وہ شمعیں روشن تھیں جن سے اکتسابِ فیض کے لیے مسلم اور غیر مسلم دنیا کے دور دراز گوشوں سے ہزار میل کے سفر کی صعوبتیں اٹھا کر آتے اور اپنے تہی دامن علم وفن کے موتیوں سے بھر کر اس نور کو پھیلانے کھڑے ہوتے۔ ان کے کتب خانے ان کے دارالتراجم اور دارلتصانیف، ان کی رصد گاہیں، اسپتال اور تجربہ گاہیں، اپنی مثال آپ تھیں۔ ان میں سے بعض کے صرف تذکرے باقی رہ گئے اور ان کے نشانات بھی مٹ گئے اور بعض اور آثارِ قدیمہ آج بھی اس عظمتِ رفتہ کے مرثیہ خواں ہیں۔ غرناطہ اور قرطبہ سے دہلی مرحوم تک اس داستان کے اجزا بکھرے پڑے ہیں۔ سرسید سوچتے تھے کہ ایسا بڑا انقلاب کیوں کر آیا۔ سلطنت گئی تو اس کے ساتھ مسلمانوں کی علمی تہذیبی اور تاریخی روایت کو کیسے گھن لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ قدآور درخت آندھیوں کی زد میں آگیا۔"(۱)

سرسید تحریک کے ہر پہلو سے اتفاق تو خود سرسید کے بعض رفقا کو بھی نہیں تھا لیکن اس بات سے کسے انکار ہوسکتا ہے کہ سرسید کے تعلیمی منصوبوں کی بدولت ہی مسلمانانِ برصغیر سامراجی آقاؤں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنا حق مانگنے کے قابل ہوئے تھے۔ بے شک پاکستان کے قیام کے لیے سرسید کی دو قومی پالیسیوں ہی نے باقاعدہ بنیاد فراہم کی تھی۔ مسلمانوں کے جداگانہ وجود کا احساس اور اردو زبان کی نثری قوت کا شعور سرسید ہی کا مرہونِ منت ہے۔ میٹرک سے بی اے، بی ایس سی تک کی لازمی، اختیاری اردو میں بھی ابواللیث صاحب کا کوئی مضمون نظر سے نہیں گزرا۔ خاص طور پر سندھ کی نصابی کتب میں، جہاں ابواللیث صاحب کے بعض شاگرد بھی نصاب مرتب کرنے والی کمیٹیوں میں شامل رہے، ان کی کسی ایک تحریر کا بھی نصاب میں شامل نہ ہونا باعث حیرت ہے۔ ایک ایسے اردو دان کو جس نے اپنی ساری زندگی اردو زبان وادب کی خدمت کے لیے وقف کر دی اور جس کا شمار بلامبالغہ اکابرینِ اردو میں ہوتا ہے، یک سر فراموش کر دیا جانا قرینِ انصاف نہیں ہے۔ مرتبینِ نصاب کو اس بارے میں غور ضرور کرنا چاہیے۔

ابواللیث صاحب کے کئی اداریے ایسے ہیں جو مکمل مضمون کا درجہ رکھتے ہیں اور درجہ بندی کر کے انھیں آٹھویں سے بی اے کے نصاب میں شامل کیا جاسکتا ہے۔

ابواللیث صاحب کے ان اداریوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بیسویں صدی کے آخری عشروں میں سرسید اور ان کی تحریک پر اعتراضات کا ایک سلسلہ پاکستان میں بھی شروع ہوا تھا۔ ابواللیث صاحب نے ان اعتراضات میں جو کچھ لکھا ہے وہ ان کے تنقیدی نظریات کو بھی ظاہر کرتا ہے۔ مثال کے طور پر درج ذیل اقتباس دیکھیے:

> "آپ میں سے اکثر نے یہ واقعہ پڑھا ہوگا کہ ایک صاحب جو تلاشِ معاش میں بہت سرگرداں تھے، سرسید کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مدد چاہی۔ سرسید نے مشورہ دیا کہ میری مخالفت میں مضمون لکھنا شروع کر دو، اللہ نے چاہا تو روزی کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ تو سرسید کو بھی تو اب لوگوں نے نہیں بخشا اور ایک سرسید کیا اس قوم نے کس کو بخشا ہے۔ لوگ 'سیرۃ النبی ﷺ'، 'الفاروقؓ'، اورنگ (زیب) عالم گیر'، اور 'شعر العجم' کے مصنف کا منھ کالا کرنے کی نیت سے ان کی داستانِ معاشقہ (III) لکھتے ہیں۔" (۲)

ایک اور اقتباس دیکھیے:

> "اقبال کی صد سالہ تقریبات کے جواب میں 'نتو درزی سے ان پڑھ فلسفی نور محمد تک' جیسے مضامین تحقیق اور حقیقت نگاری کا نام دے کر شائع ہوئے۔ اس کے پہلے اقبال اور عطیہ کے خطوط غالباً اسی تحقیق اور حقیقت نگاری کا سلسلہ تھے۔ (IV) وہی اقبال جن کے نام پر یہ دانش ور آج بھی پل رہے ہیں۔" (۳)

درج بالا اقتباسات سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ ابواللیث صاحب مولانا الطاف حسین حالی کی ان تنقیدی روایات کے امین تھے جن میں فن اور مصنف کی صرف خوبیوں سے سروکار رہتا ہے اور خامیوں سے شعوری طور پر صرفِ نظر کیا جاتا ہے۔ خاص طور پر ایسے ادبا جنھیں قومی ہیروز کے روپ میں پیش کیا جاتا ہے ان کی شخصی خامیوں اور کوتاہیوں کو بیان کرنے سے گریز کیا جاتا ہے۔ احترامِ سلف کا یہ جذبہ ابواللیث صاحب کی تمام تحریروں میں نمایاں ہے۔ ایسے بیانات میں جہاں احترامِ سلف کے جذبے کو ٹھیس پہنچتی ہے، ان کا لہجہ بھی خاصا سخت ہو جاتا ہے۔ اس اعتبار سے ان کی تنقید کو تاثراتی کہا جاسکتا ہے۔ نومبر/۱۹۸۷ میں سید محمد ہادی کی کتاب "علی برادران اور ان کا زمانہ" مکتبہ جامعہ ملیہ لمیٹڈ، دہلی سے شائع ہوئی، جس کا تعارف عبدالغنی ڈار نے لکھا۔ اس کتاب پر ابواللیث صاحب نے اپنے ایک اداریے میں تفصیلی تبصرہ کیا ہے۔ آگے بڑھنے سے پہلے درج ذیل اقتباس بھی دیکھتے چلیے:

> "تعارف نگار مصنف کے بارے میں حسن ظن کا شکار ہیں۔ یہ کوئی بری بات نہیں لیکن حق گوئی اور حق پسندی کو ایمان بالغیب کا درجہ دینا تعارف یا تبصرے کی نفی کر دیتا ہے۔ اگر حقیقی تصویر اور حقیقت نگاری کا مقصد تاریخی حقائق کی تلبیس اور ان کو اپنی پسند ناپسند، اپنے مسلک سے اتفاق یا اختلاف یا ضرورتِ وقت کے تقاضوں کے مطابق ڈھال

لینا ہے تو پھر کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، اس کتاب میں جیسا کہ آگے چل کر ہم عرض کریں گے، یہی مقصد اس حقیقی تصویر نگاری کا ہے۔ یہ صرف وہ انداز ہے جسے آج کی اصطلاح میں 'کراد رکشی' کہتے ہیں۔"(۴)

ابواللیث صاحب، دراصل، آزادیِ اظہار کی بھی حدود مقرر کرنے کے قائل ہیں۔ ان کی نظر میں قلم کی آزادی کا مطلب اسلاف کا تمسخر اڑانا نہیں ہے۔ ایک جگہ انھوں نے آزادیِ قلم کے ایسے تصور پر طنز کرتے ہوئے لکھا ہے:

"اب ہر شخص کا دعویٰ ہے کہ وہ بھی منھ میں زبان رکھتا ہے اور جو چاہے کہہ دے، کوئی اس کے منھ میں لگام نہیں دیتا، نہ دے سکتا ہے اور ہر شخص کا یہ دعوا ہے کہ قلم اس کے ہاتھ میں ہے اور اس سے وہ جو چاہے لکھ دے کوئی اس سے پوچھنے والا نہیں۔ بونے قد والے جنات جیسی قد آور شخصیتوں کے کارناموں پر اس لیے پردہ ڈال رہے ہیں کہ ان کی چھوٹی شخصیتوں کا قد بڑا نظر آنے لگے اور اس کے لیے وہ چھوٹی چھوٹی عصبیتوں کا سہارا لیتے ہیں۔"(۵)

درج بالا اقتباسات دو تاچار ان کے فروری ۱۹۸۵ کے اداریے سے لیے گئے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے بعض اداریے تنقیدی مضامین کا درجہ بھی رکھتے ہیں۔ ان کا اسلوبِ تنقید تاثراتی ہوتے ہوئے نظریاتی بھی ہے، یعنی انھوں نے ادب کو اول ایک مسلمان اور پھر پاکستانی ناقد کی آنکھ سے دیکھا ہے۔ اکابرین کے اندازِ تنقید کی اس روش سے بھی ادب کے طلباء کا واقف ہونا ضروری ہے۔ ابواللیث صاحب نے اداریوں میں ادباء پر بھی بھرپور انداز میں لکھا ہے۔ اس کی مثال کے لیے جولائی/۱۹۸۴ء کا اداریہ دیکھا جاسکتا ہے جو مولانا حسرت موہانیؔ پر ہے۔ تین صفحات کے اس مختصر سے مضمون میں انھوں نے اہم معلومات فراہم کی ہیں۔ مذکور اداریے سے ایک اقتباس درج ہے:

"۱۹۰۳ء میں مولانا نے اسی رسالے (اردوے معلیٰ) میں ایک مضمون چھاپا جس میں مصر کے مشہور لیڈر مصطفا کامل (کذا: کمال) کی موت پر اظہار خیال کیا گیا اور انگریزوں کی مسلم کش پالیسی پر سخت تنقید کی گئی تھی۔ مضمون مولانا نے نہیں لکھا تھا اور مولانا نے مضمون نگار کا نام بھی شائع نہیں کیا۔ اس مضمون کو باغیانہ قرار دیا گیا۔ مولانا نے مضمون نگار کا نام ظاہر کرنے سے انکار کر دیا۔(V) اور خود دو سال قید بامشقت گوارا کر لی۔ اس قید میں مولانا کا مسکن ایک چھ فٹ لمبی اور چار فٹ چوڑی کوٹھڑی تھی۔ آج کل کے سیاسی رہنماؤں کے بنگلوں میں ان کے غسل خانے بھی اس سے زیادہ وسیع ہوتے ہیں اور اس میں مولانا کے بدن پر ایک کرتی اور ایک جانگیہ اور اس کی مولانا کو پرواہ نہ تھی۔ سوائے اس کے کہ نماز کے لیے اس سے پوری ستر پوشی بھی نہیں ہوتی تھی۔ ایک ٹاٹ کا ٹکڑا تھا، وہ بستر، وہی جانماز اور ایک ڈبہ پانی پینے، آب دست وضو کرنے کے لیے عطا ہوا تھا اور اس عالم میں مولانا نے ماہ رمضان گزارا۔"(۶)

ایک اور مثال جنوری ۱۹۸۵ء کے اداریے کی ہے جو مولانا محمد علی جوہر کے متعلق ہے۔اس کا مضمون بھی تین صفحات پر مشتمل ہے۔اس کا بھی ایک اقتباس دیکھتے چلیے:

"جیسا کہ ناظرین کے علم میں ہے، وہ گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے اسٹریچر پہ ڈال کر جہاز پر پہنچائے گئے تھے اور وہاں انھوں نے تاریخی تقریر میں فرمایا تھا کہ اگر آپ امیرے ہاتھ میرے ملک کی آزادی کا یہ پروانہ نہیں دیں گے تو آپ کو اپنے یہاں مجھے قبر کے لیے دو گز زمین دینی پڑے گی اور انھوں نے جو کہا تھا اللہ تعالیٰ کو منظور تھا کہ وہ اسی طرح ہو۔انھیں برطانیہ میں پیغام آیا لیکن ان کا مدفن بیت المقدس کی وہ سرزمین ہے جو پیغمبروںؑ اور انبیا کرامؑ کا مدفن ہے۔"(۷)

نومبر دسمبر/۱۹۸۵ء کے اداریے کا ذکر اوپر ہو چکا جو علامہ اقبال کے متعلق ہے اور تینتیس صفحات پر مشتمل ہے۔غرض کہ ان اداریوں میں کئی ادبی شخصیات پر مضامین اور ان سے متعلق اہم معلومات درج ہیں جو ادب کے طلباء کے لیے معاون ہو سکتی ہیں۔انھیں بالکل ہی غیر اہم جان کر پرانے رسالوں کی فائلوں میں دبا رہنے دیا جانا قرینِ انصاف نہیں ہے۔ان اداریوں میں ابواللیث صاحب معاشرتی نقاد کے طور پر بھی سامنے آئے ہیں۔ان کا تعلق ہندوستان کے مسلمانوں کی اس نسل سے تھا جس نے تحریک پاکستان کی جدوجہد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا، ہجرت کا کرب سہا تھا اور نہ جانے کیسی کیسی آرزوئیں لیے اس خوابوں کی سرزمین پر قدم رکھا تھا۔انھیں کیا معلوم تھا اسی پاک سرزمین پر جس کے نغمے پڑھتے ہوئے انھوں نے نجانے کیسے کیسے خواب آنکھوں میں سجا لیے تھے، ایک طبقہ ایسا بھی پیدا ہو جائے گا جو لسانی تعصب میں مبتلا ہو کر "اردو زبان" پر دشنام طرازی کرتے وقت اس حقیقت کو بھی فراموش کر دے گا کہ یہ وہی زبان ہے جسے ہندوستان کے مسلمانوں نے بالاتفاق اپنی قومی زبان تسلیم کیا تھا اور اسی لیے قائدِ اعظم نے فرمادیا تھا کہ پاکستان کی قومی زبان صرف اور صرف اردو ہو گی۔

پاکستان میں اردو کو سرکاری زبان بنانے کے لیے ایک مدت مقرر کی گئی تھی مگر قائدِ اعظم کی زندگی نے وفا نہ کی اور یہ مسئلہ ان کی زندگی میں حل نہیں ہو سکا۔ابواللیث صاحب خود بھی پاکستان بننے سے قبل علی گڑھ کے پلیٹ فارم سے اس وقت "اردو زبان" کی بقا کی جنگ لڑتے رہے تھے جب گاندھی جی نے اردو کو قرآنی حروف میں لکھی ہوئی مسلمانوں کی زبان قرار دیا تھا۔حد تو یہ ہے اردو سے بغض کی وجہ سے اردو بولنے والوں کو بھی معاف نہیں کیا گیا۔یہ پاکستان ایسی نظریاتی سرزمین پر وجود پذیر وہ تاریخی حقائق ہیں جن سے کسی صورت انکار نہیں کیا جا سکتا اور جنھیں جان کر آج کی نوجوان نسل باآسانی اندازہ لگا سکتی ہے کہ آخر وہ کون سی رکاوٹیں ہیں جو پاکستان کی سرزمین پر پاکستانیوں کی اپنی زبان "اردو" کے حقیقی نفاذ کی راہ میں حائل رہی ہیں۔ابواللیث صاحب ستمبر/۱۹۸۹ء کے اداریے میں بڑے دکھ سے اس کا اظہار کیا ہے:

"چند دنوں سے اردو بولنے والوں کو طرح طرح کے خطابات سے نوازا جا رہا ہے، مثلاً یہ کہ یہ ان لوگوں کی زبان ہے جو جیب کترے، دلال اور بدمعاش تھے اور ان کی عورتیں جو چست پاجامے اور غرارے پہنتی ہیں رنڈیاں تھیں جن

کو کبوتریاں کہتے تھے۔ سبحان اللہ ہم بھی کن کن خطابات کے مستحق ٹھہرے، چلیے مجبوری و بے چارگی لیکن اردو زبان کے بارے میں، اس کی اصل اور ارتقاء کے بارے میں وہ لوگ بھی خامہ فرسائی کر رہے ہیں جو اپنی جہالت سے روزی پیدا کرنے کے خواہش مند ہیں۔"(۸)

اس کے ساتھ ایک ایسا صاحبِ اختیار طبقہ بھی موجود تھا اور ہے جو اردو زبان کا استحصال صرف اور صرف اس لیے کر رہا ہے تاکہ انگریزوں کی زبان اور اس کے رنگ ڈھنگ اپنا کر عوام پر اپنی فوقیت قائم رکھ سکے۔ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ زبان تہذیب کی ترجمان ہوتی ہے۔ انگریزی بہروپ اس وقت تک کارگر نہیں ہو سکتا جب تک اسے بھرنے والا انگریزی زبان کی دھاک نہ بٹھا دے۔ ابواللیث صاحب امریکہ اور برطانیہ کی یونیورسٹیوں میں پڑھے بھی ہیں اور پڑھایا بھی ہے۔ وہ انگریزی تقریر و تحریر پر اچھی خاصی گرفت رکھتے تھے مگر وہ اس طبقے کے کڑے نقاد تھے جو انگریزی کو اردو زبان اور مشرقی تمدن کی حقارت کا ذریعہ سمجھتا تھا۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"انگریزی ہماری سر آنکھوں پر ہمارے سابق آقاؤں کی زبان ہے جو ہمیں چھوڑ گئے۔ ہم ان کے قدیم نمک خوار ہیں اور ہمارا ہی ایک طبقہ ان کے مفادات کی نگرانی کے لیے اپنی اولاد کو ان ہی کے رنگ ڈھنگ میں ڈھال کر اس معاشرے کے ایک ممتاز اور حاکم طبقہ میں رہنا چاہتا ہے اور انگریزوں کی جگہ وہ ان کا خلیفہ بن کر حکومت کرنا چاہتا ہے۔"(۹)

ان اداریوں میں ایسے زعلما، زعما اور صاحبانِ اختیار پر بھی تنقید موجود ہے جو عوام کی فلاح و بہبود کے لیے بے لوث کام کرنے کی بجائے صرف اپنی تشہیر چاہتے ہیں۔ جب تک شہرت، دولت، انعامات، صلے، مراعات اور عہدوں کی ہوس کو بالائے طاق نہ رکھ دیا جائے، اس وقت تک قومی ترقی کا حصول ممکن نہیں ہوتا۔ قوم کو عروج پر لے جانے کے لیے رہ نماؤں کو اپنی ہستی مٹانی پڑتی ہے۔ بدقسمتی سے وطنِ عزیز پر شروع ہی سے ایسے لوگوں کی اجارہ داری رہی ہے جنھیں قومی بھلائی سے کبھی کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ ان میں بلا تخصیص علما بھی شامل ہیں اور زعما بھی۔ ابواللیث صاحب نے لکھا ہے کہ: ہمارے ایسے عالم لیڈر ہیں جو سرکاری خرچ پر پانچ ستاروں والے ہوٹل میں قیام کرتے ہیں اور عوام کی نمائندگی کے دعوے دار ہیں جب بستیاں اجڑ جاتی ہیں اور آباد علاقے ویران ہو جاتے ہیں تو یہ فوٹو گرافروں کے ساتھ بستیوں کے مکینوں کی دل دہی کے لیے تشریف لاتے ہیں۔"(۱۰) اس بیان کی روشنی میں دیکھا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ وقت بہت کچھ تبدیل ہو گیا ہے مملکتِ اسلامی کے صاحبانِ اختیار کے رویوں میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ ایوانوں کی منافقت میں مدرسے بھی شروع ہی سے برابر کے شریک رہے ہیں۔ سرکاری مال اور وسائل کی لوٹ کھسوٹ اور اور ان کے بے دریغ و بے جا استعمال میں یہ بھی کم نہیں ہیں۔ ابوالاعلیٰ صدیقی نے لکھا ہے:

"صاحبانِ عالی شان اور حاکمانِ والا شان جو چاہیں کریں، کم از کم اسلام کو آڑ بنا کر اپنے اعمال پر پردہ ڈالنے کی کوشش نہ کریں۔ کیا ان کے خیال میں علما کی ایک دو کانفرنس بلا کر کوئی اسلامی انقلاب لا سکتا ہے۔ اس کے لیے احتساب کی ضرور

ت ہے، حاکموں اور محکوموں، طاقت وروں اور کمزوروں، صاحبانِ اختیار اور مجبوروں، دولت مندوں اور غریبوں کے احتساب کے بغیر صرف باتیں ہی باتیں ہیں۔"(۱۱)

صاحبان اختیار کے ایسے اعمال کا نتیجہ زوال کی صورت ہی میں وقوع پزیر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عوام چوروں اور ڈاکوؤں کے ہاتھوں یرغمال بن جاتے ہیں۔ زندگی کی بڑھتی ہوئی ضروریات، معاشی انحطاط، بے روزگاری، عدم تحفظ کا احساس منشیات کے استعمال کو فروغ دینے کا باعث بن جاتا ہے۔ بڑے بڑے ناموں والے عوام کے ان دکھوں کا چارہ تو نہ کر سکے۔ البتہ ان کی زبوں حالی کا علاج کرنے کے لیے خود منشیات فروشی کے سود مند کاروبار سے وابستہ ہو گئے۔ لہٰذا نظریاتی طور پر اسلام کے نام پر بنائی جانے والی مملکت اس تباہ شدہ دہلی کا نقشہ پیش کرنے لگی جہاں نہ کسی کی دستار محفوظ تھی، نہ سر۔ ابوالا بواللیث صدیقی نے اس معاشی زوال کی تصویر کشی یوں کی ہے:

"اخلاقی معیار گرتا جارہا ہے، بل کہ کہیں تو بے جانہ ہو گا کہ یہ بھی عنقا ہے۔ منشیات کا رواج عام ہے اور اس کا کاروبار سب سے زیادہ نفع کا کاروبار ہے اور اس میں بڑے بڑے پردہ نشینوں کے نام شامل ہیں۔ چوری ڈکیتی کا حال دیکھ کر سوداؔ کا وہ قصیدہ یاد آتا ہے جس میں دہلی کے کوتوالِ شہر کا حال بیان ہوا ہے کہ چور بیچ چوراہے کے اس کے سر سے پگڑی اتار کر اسی سے پوچھتا ہے کہ میاں اس کے کیا دام دو گے؟(VI) نہ کسی کی عزت سلامت ہے اور نہ عصمت محفوظ، اپنی پگڑی سنبھالنا دشوار ہے۔ اسی زمانے میں میر کو نصیحت کی گئی تھی کہ 'پگڑی اپنی سنبھالیے گا میرؔ اور بستی نہیں یہ دہلی ہے'، اور اب ہمارا ہر گلی کوچہ میرؔ کے زمانے کی دہلی سے بڑھ کر ہے۔"(۱۲)

اس کے ساتھ ہی بے عملی اور کاہلی بھی پنپنے لگی اور بقول ابواللیث صاحب: "یہ ہمارا قومی مزاج بن گیا ہے کہ ہم کام کم کرتے ہیں، اوروں کے کام پر اعتراض زیادہ کرتے ہیں، کیوں کہ اعتراض کرنا آسان ہے اور جب اعتراض کرنے والا خود کوئی کام ہی نہیں کرے گا تو پھر اعتراض کس چیز پر ہو گا۔"(۱۳) ایسے ہی ادوار، جب ہر آدمی کو دوسرے کے گریبان میں جھانکنے کی عادت پڑ جائے، ہجو گوئی کے لیے بھی موثر ہوتے ہیں۔ ابواللیث صاحب نے جن معاشرتی مسائل پر قلم اٹھایا ہے یہ ترقی پسندوں کے ہاں عام پائے جاتے ہیں۔ وہ ترقی پسند نہیں ہیں بل کہ ترقی پسندوں کے اچھے خاصے مخالفین میں سے تھے۔ البتہ ترقی پسند تحریک سے الگ انھوں نے ترقی پسندی کا ایک اور معیار قائم کر رکھا تھا جو سر سید تحریک کا تسلسل تھا۔ سر سید کی تحریک میں اگر پاکستانی قومیت کا بھی شدید احساس پیدا کر دیا جائے تو ابواللیث صاحب کی تنقیدی فکر واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے۔ ان کی تنقید کا یہ انداز اردو ادب میں غیر دریافت شدہ ہے۔ اردو ادب کی بہت سی تاریخیں لکھی گئی ہیں۔ خود ابواللیث صاحب نے بھی ایک تاریخ لکھی ہے۔(VII) مگر اب ادبی تاریخ نگاری صرف ادیبوں شاعروں کی ولادت وفات اور ان کی تخلیقات کی تواریخ کی تحقیق ہی تک محدود نہیں رہی کیوں کہ اگر ایسا ہو جائے تو جوں جوں حقائق دستیاب ہوتے رہیں گے تاریخ نگاری کے امکانات کم سے کم ہوتے چلے جائیں گے۔ اس لیے اب ادبی محقق کے لیے ضروری ہے کہ وہ ادبی تاریخ کو

اپنے نکتہ نظر (Vision) کے مطابق مرتب کرے اور ایسی تاریخ لکھنے کے لیے ادیب کے کے معاشرتی تجربات اور تجزیوں سے صرف نظر نہیں کیا جاسکتا۔ قیام پاکستان اور تحریک پاکستان کے پس منظر میں جب ادبی تاریخ لکھی جائے گی تو ابواللیث صاحب کے یہ اداریے خاصے معاون ثابت ہوں گے۔

ابواللیث صاحب کے ان ابتدائیوں میں کئی اہم یاداشتیں بھی موجود ہیں جو اکثر علی گڑھ اور علی گڑھ کی اہم شخصیات سے متعلق ہیں۔ان میں ایسے ایسے واقعات درج ہیں جو کہیں اور نہیں ملتے۔ مثال کے طور پر اپریل/۱۹۸۹ء کے اداریے میں انھوں نے ڈاکٹر سر ضیاالدین کا ذکر کیا ہے اور ان کی وائس چانسلری کے دور کا ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے بتایا ہے کہ ان کے دور میں علی گڑھ میگزین میں ایک نظم شائع ہوئی جس کا ایک مصرعہ یہ تھا: "پھر کسی غزنی سے کوئی غزنوی پیدا کروں "گاندھی جی اس زمانے میں نئی دہلی میں کسی آشرم میں پراتھنا میں مصروف تھے،اس نظم پر تبصرہ کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ یہ علی گڑھ والے پھر کسی غزنوی کو ہندوستان پر حملے کی دعوت دے رہے ہیں۔ گاندھی جی کے اس تبصرے پر اچھا خاصا ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ وائسراے نے گورنر، گورنر نے کمشنر اور کمشنر نے کلکٹر کو خبر دی۔ شاعر کے ایک مصرعے سے ایوانوں میں طوفان کھڑا ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر سر ضیا الدین کو رسالہ واپس لینے کی ہدایات کی گئیں۔ چناں چہ انھوں نے حکم دیا مگر طلبا اس پر راضی نہ ہوئے۔ انھوں نے ڈاکٹر صاحب کے خلاف مظاہرے کیے۔ان کے ساتھ اچھی خاصی بد تمیزی کی اور استعفا لے کر ہی دم لیا۔(۱۴)

علی گڑھ کے پوسٹ مینوں، ٹھیلے والوں کا ذکر بھی ان اداریوں میں ملتا ہے۔ان کی اولاد شاید انھیں فراموش کر چکی ہو مگر ابواللیث صاحب نے انھیں اردو ادب کی زینت بنا دیا ہے۔ جون ۱۹۹۲ء کے اداریے سے، جسے مضمون کی نسبت سے "کیسے کیسے لوگ" کا عنوان دیا گیا ہے، درج ذیل اقتباس دیکھیے:

> "یہ کون؟ یہ میاں کھمانی۔ان کا ذکر رشید صاحب نے بھی کیا ہے، ہم نے جب دیکھا، آفتاب ہاسٹل کی بغل میں انجینئرنگ آفس تھا، اس کے برآمدے میں پان سگریٹ رکھے رہتے، خریدنے والے خریدتے ورنہ یوں ہی دو چار بولیوں ٹھولیوں کے لیے ٹھہر جاتے۔ برابر میں پروفیسر کا دفتر تھا۔ عبادت الرحمان خان مرحوم، قد آور شخصیت بڑے آن بان والے تھے، وہ گزرتے تو کھمانی سے دعا سلام ہوتی۔ کھمانی اپنی عینک، جو ایک کمانی سے محروم، ان کے کان پر لٹکتی، ناک پر نیچے لا کر، خان صاحب کو دیکھتے، خوش ہو جاتے اور دعائیں دیتے۔"(۱۵)

ابواللیث صاحب ماہرِ تعلیم بھی تھے۔اس میدان میں ان کا تجربہ خاص و سیع تھا۔انھوں نے نظامِ تعلیم کو بہتر بنائے جانے کے لیے، مختلف اوقات میں بنائی گئی پالیسیوں پر بھی اپنی ماہرانہ آرا بے باکی سے قلم بند کیں جو "تہذیب" کے مختلف اداریوں میں موجود ہیں۔ان کا موقف تھا کہ تعلیم صرف نصابی کتب رٹنے ہی سے حاصل نہیں ہوتی بل کہ اس کے لیے طالب علم کو ایک تربیتی ماحول کی ضرورت ہوتی ہے جس کی ابتدا اوّل گھر سے ہوتی ہے۔ یہ غالباً وہی موقف ہے جو ہمیں اقبال کے مشہور شعر "یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی/سکھائے کس نے اسماعیل کو آدابِ فرزندی" میں

بھی نظر آتا ہے۔ ۱۹۸۸ء میں حکومت نے نظامِ تعلیم کو اسلامی بنانے کے لیے ایک کمیشن مقرر کیا جس نے کچھ سفارشات پیش کیں۔ ابواللیث صاحب نے اکتوبر ۱۹۸۸ کے اداریے میں حکومت کے اس تعلیمی منصوبے پر رائے دیتے ہوئے لکھا:

"تعلیم کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کا کام، محض نصاب میں یا درسی کتابوں میں، اسلام کا نام، مسلمانوں کی تاریخ کے چند واقعات کے بیان اور اسلامی اخلاقی اقدار کے ذکر سے حاصل ہو جاتا تو بات بہت آسان ہو جاتی۔ یہ مطلب تو صرف معاشرے میں اسلامی انقلاب سے حاصل ہو سکتا ہے۔ بچہ اگر کسی کتاب میں پڑھتا ہے کہ جھوٹ بولنا بری بات ہے، لیکن گھر پر کوئی آواز دے تو ابا جان فرماتے ہیں کہ دو ابا گھر پر نہیں اور بچہ اس پر عمل کرتا ہے۔ غرض بچہ جو کچھ کتابوں میں پڑھتا ہے، اسے صرف ایک کتابی بات سمجھتا ہے جس کا عملی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ بچے کو اپنے گرد و پیش جو کچھ نظر آتا ہے، وہ ایک حقیقت ہوتی ہے۔"(۱۶)

ان اداریوں میں مادری زبان کے نظام تعلیم ہونے، اردو کے نفاذ کے لیے اٹھائے جانے والے اقدامات اور اردو رسم الخط سے متعلق سنجیدہ علمی مباحث بھی شامل ہیں۔ ابواللیث صاحب کے کئی اداریے انشائیوں کی سرحد میں داخل ہو جاتے ہیں۔ ان میں زیادہ تر وہ ہیں جنھیں کوئی عنوان دیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر "مسئلہ کیا ہے؟"، "قدر دانیِ عالم بالا معلوم شد"، "ہٹ یا رٹ"، "گھوڑے اور گدھے"، "گدھوں کی تعداد میں اضافہ"، "کچھ عطائی طبیبوں کے بارے میں"، اور "ادبی خرکار" وغیرہ، ایک جگہ موضوع کی مناسبت سے سوالیہ علامت "؟" کی تکرار (؟؟؟؟) کو بھی عنوان بنایا ہے۔ ایسے اداریوں میں بڑے ہی لطیف پیرائے میں اپنا مدعا بیان کیا ہے۔ مثلاً جون/۱۹۸۹ء کے اداریے میں انھوں نے انگریزی نظامِ تعلیم کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ اس اداریے کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے: "خدا بخشے اکبر الٰہ آبادی بڑے مزے دار آدمی تھے۔ شاید الٰہ آباد کے امرودوں سے کچھ زیادہ ہی شہرت رکھتے تھے۔ اب الٰہ آباد میں کوئی اکبر نہیں، سنا ہے امرودوں کی وہ نسل بھی ختم ہو گئی ہے۔"(۱۷)

اکبر الٰہ آبادی کے ذکر سے بات ان کی علامتی شاعری تک پہنچتی ہے۔ ان کے "اونٹ" کے استعارے کا ذکر ہوتا ہے اور اونٹ کا ذکر ابواللیث صاحب کے ذہن کو ان کے آبائی شہر بدایوں کے آس پڑوس کے دیہاتوں میں سفر کے لیے استعمال کی جانے والی اونٹ گاڑی کی طرف منتقل کر دیتا ہے۔ یہ اونٹ گاڑی دو منزلہ بنائی جاتی تھی۔ ایک منزل میں سوار اور دوسری میں سواریاں۔ سفر اکثر رات ہی کو ہوتا۔ مسافر اونٹ گاڑی کی مہار منزل کی طرف موڑ دیتے اور خود سو جاتے، بے چارہ اونٹ اسی سمت میں چلتا رہتا اور وقت پر منزل پر پہنچ جاتا مگر ایک بار یوں ہوا کہ گاڑی روانہ ہوئی تو کسی ظالم نے آدھی رات کے وقت، جب آدھا فاصلہ طے ہو چکا تھا، اونٹ کی مہار اسی سمت پلٹ دی جہاں سے وہ روانہ ہوا تھا۔ اونٹ بے چارہ اسی سمت چلنے لگا۔ صبح جب مرغِ سحر نے اذان دی اور مسافر بے دار ہوئے تو معلوم ہوا کہ وہیں تھے جہاں سے چلے تھے(۱۸)۔ یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"یہ قصہ ہمیں یوں یاد آیا کہ طویل مدت سے ہمارے ماہرین تعلیم کے نزدیک ہماری تعلیمی پسماندگی کا سب سے بڑا سبب ہمارے نظام تعلیم پر انگریزی زبان کا غلبہ ہے اور جب تک ہم اپنی تعلیم کی منصوبہ بندی میں اپنی زبان کو وہ مقام

نہیں دیں گے جس کی وہ مستحق ہے، ترقی کی کوششیں بے سود ہیں۔ کچھ دستوری شق کے حوالے سے اور کچھ مجبوریوں سے ہم بادلِ ناخواستہ اردو کی ترقی کا نام لینے لگے ہیں اور کچھ عرصہ پہلے یہ فیصلہ بھی ہوا کہ ایک مدتِ معینہ کے بعد میٹرک تک ذریعہء تعلیم صرف اپنی زبان ہو گی لیکن تازہ ترین حکم یہ ہے کہ انگریزی کو لازمی طور پر پہلی جماعت سے پڑھایا جائے اور بجائے رب کا شکر ادا کر بھائی، جس نے تیری گائے بنائی، Baba Black Sheep سے تعلیم کا آغاز ہو۔ ٹھیک ہے، بھیڑ کا مزاج پیدا کرنے کے لیے Sheep ہی مناسب علامت ہے۔(۱۹)

ابواللیث صاحب، رشید احمد صدیقی ایسے طنز و مزاح نگار کے شاگرد تھے اور اس شاگردی پر انھیں فخر بھی تھا۔ اگر ان کی پوری توجہ تحقیق اور لسانیات کی طرف نہ ہوتی تو ان کے اندر ایک بڑا طنز و مزاح نگار چھپا ہوا تھا اور وہ اس میدان میں خاصا نام کما سکتے تھے۔ سوانح کے علاوہ ان کے صرف یہی ادبی اداریے ہیں جہاں ان کی تخلیقی صلاحیتیں نکھر کر سامنے آتی ہیں۔ ان کے کئی انشائیہ نما اداریے فکاہی ادب کے زمرے میں آتے ہیں۔ تاہم کہیں کہیں طنز میں شدت بھی نمایاں ہوتی ہے مگر ابتذال کی کیفیت کہیں پیدا نہیں ہوتی اور زیرِ لب تبسم بھی پیدا ہوتا ہے۔ درج ذیل اقتباسات دیکھیے:

"سو قصہ یہ ایک عالم یا سخن داں کا ہے جس نے ساری عمر خونِ جگر کو کاغذ پر منتقل کیا لیکن اسے کوئی قدر دان نہ ملا، بے چارے نے مایوس ہو کر آسمان کی طرف دیکھا اوپر سے کوئی چیل (آپ شہباز سمجھ لیں) اڑتی ہوئی گزری اور اس نے جو بیٹ کی، وہ بے چارے کی پیشانی پر تمغہ بن کر گری۔ کہنے لگا قدر دانیِ عالم بالا معلوم شد۔"(۲۰)

"اصل میں خرکاری ادبی میدان میں ایک اور رنگ میں تھی۔ مجھے ابھی تک اپنے بچپن کا ایک منظر یاد ہے۔ یہ ہندوستان کا ایک بڑا شہر تھا۔ اس کے ایک بڑے بازار میں پھلوں اور مٹھائیوں کی بہت سی دکانیں تھیں، ویسے اسی سے ذرا آگے بڑھ کر طوائفوں کی ایک بستی تھی۔ یہاں پر ایک دکان پر ایک بڑا بورڈ لکھا تھا۔ پوری عبارت یاد نہیں، کچھ اس قسم کی تھی۔ غزل درجہ اول ایک روپیہ فی شعر، غزل درجہ دوم آٹھ آنہ فی شعر، غزل درجہ سوم چار آنہ فی شعر، قصیدہ درجہ اول دس روپیہ فی قصیدہ، قصیدہ درجہ دوم پانچ روپیہ فی قصیدہ، اصلاح فی غزل دس شعر تک پانچ روپیہ وغیرہ وغیرہ، دکان خوب چلتی تھی۔ اب اس کی شاخیں ہندوستان، پاکستان دونوں جگہ ہیں، نام بدل گئے ہیں۔"(۲۱)

طنز و مزاح پیدا کرنے کے لیے مصنف کئی طرح کا اہتمام کرتے ہیں۔ بسا اوقات جملے کے ذریعے طنز و مزاح کی کیفیت پیدا کی جاتی ہے۔ بعض اوقات اس کے لیے کوئی واقعہ بیان کیا جاتا ہے، کبھی کبھی لفظوں کے تغیر و تبدل سے بھی یہ کام لیا جاتا ہے۔ ابواللیث صاحب نے اداریوں میں تینوں کیفیات موجود ہیں۔ درج ذیل اقتباسات دیکھیے:

"پاکستان کی دولت سے کتنے حرام زادے نواب زادے بن گئے اور یہ نواب یہاں آ کر فقیر زادہ بن گیا۔"(۲۲)

"یہ ہمارے دوسرے دوست ہیں۔ان کا مسئلہ کیا ہے؟ صاحب سر پر چھت نہیں، تنخواہ کا آدھے سے زیادہ کرایہ نذر ہو جاتا ہے۔ لگژری فلیٹ اور بنگلوں کے خوب صورت اشتہار پڑھتے ہیں، قیمت آپ کے تصور سے کم (علاوہ قرضہ) اور یہ قرضہ اتارتے اتارتے خریدنے والا یا بنانے والا خود کسی گورستان میں مفت دائمی مکان کی امید میں دفن ہوتا ہے۔ چند روز بعد قبر کو دوسرے آنے والے کے لیے تیار رکھتے ہیں۔ کیا کریں جاے تنگ است و مرداں بسیار، یہاں زندوں کے رہنے کو ٹھکانہ نصیب نہیں، آپ مردوں کی بات کرتے ہیں۔"(۲۳)

"سنا اور پڑھا تھا کہ 'ہٹ' کی تین قسمیں ہوتی ہیں، راج ہٹ، تریا ہٹ اور بالک ہٹ۔۔۔اور ایک چیز رٹ ہوتی ہے۔"(۲۴)

"گدھا دوڑ صرف کراچی میں ہوتی ہے اور بلاشبہ ہم نے یونیورسٹی روڈ پر گدھوں کی دوڑ دیکھی ہے۔ کیا کہنا، خوب دوڑتے ہیں لیکن محض دوڑنے سے کیا ہوتا ہے۔ وہ گھوڑے تو نہیں بن جاتے رہتے گدھے ہی ہیں۔ یوں ہمارے ہاں بہت سے گھوڑوں میں بھی گدھوں کی خوبیاں پائی جاتی ہیں اور اسی لیے ان کو استعارہ میں گدھا کہتے ہیں۔"(۲۵)

درج بالا اقتباس ان کے اداریے "گدھوں کی تعداد میں اضافہ" سے لیا گیا ہے جو ان کی وفات سے دو ماہ پیش تر جولائی/۱۹۹۴ء میں شائع ہوا۔ انھوں نے ان اداریوں میں اپنی زندگی کے بعض احوال بھی نقل کیے ہیں۔ ہم ڈاکٹر ابوالابوالليث صدیقی کو اردو ادب کے پی ایچ ڈی ڈاکٹر کی حیثیت سے جانتے ہیں جنھیں ان کے مقالے "لکھنؤ کا دبستانِ شاعری" پر علی گڑھ یونیورسٹی سے ۱۹۳۸ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری ملی تھی مگر ایک اداریے میں جس کا عنوان "کچھ عطائی طبیبوں کے باب میں" ہے، انھوں نے اپنی زندگی کی ایک ایسی حقیقت سے پردہ اٹھایا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ موصوف میٹرک کرتے ہی ڈاکٹر بن گئے تھے۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ ۱۹۳۲ء میں میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد وہ حصول تعلیم کے لیے علی گڑھ جانے کا پروگرام بنا رہے تھے تو ان کے ایک عزیز نے جو کسی محکمے میں سرکاری ملازم تھے اور مشغلے کے طور پر ہومیوپیتھک دوائیوں کا ایک بکس بھی رکھتے تھے، انھیں مشورہ دیا کہ وہ بھی ان کی طرح ڈاکٹری شروع کر دیں۔ انھوں نے کیا کہا ابوالليث صاحب کے الفاظ میں دیکھیے:

"والدہ تمھاری ڈاکٹر تھیں، بڑے بھائی آگرہ میڈیکل اسکول سے اپنی پڑھائی نامکمل چھوڑ کر بھاگ نکلے تھے۔ میں آسان نسخہ بتاتا ہوں۔ کلکتہ میں ایک ادارہ ہے جس کا نام ہنیمن کالج ہے، اس کو بیس روپیہ بذریعہ منی آرڈر بھیج دو، وہ ایک سند، ایک کتاب اور ایک ڈبہ مع دواؤں کے بھیج دے گا۔ بورڈ لکھوا کر گھر کے دروازے پر لکھوانے کی دیر ہے ،بس سمجھو ڈاکٹر ہو گئے۔ سو شوق میں ہم بھی راضی ہو گئے اور بیس روپیہ بھیج کر وہ سند، کتاب اور ڈبہ منگوایا اور پھر یوں ہوا کہ بدایوں میں ہیضہ پھیلا اور ہم خلقِ خدا کی خدمت کے لیے ان بستیوں کے چکر لگانے لگے۔"(۲۶)

ابواللیث صاحب نے اپنے ان فکاہی اداریوں میں جو اسلوبِ نگارش اختیار کیا ہے اس سے زیادہ تر زیرِ لب تبسم ہی کی کیفیت پیدا ہوتی ہے لیکن کہیں بے ساختہ قہقہہ بھی نکا جاتا ہے۔ اس کی مثال ان کا جولائی ۱۹۹۰ء کا اداریہ ہے جس کا عنوان بھی اچھوتا ہے۔ انھوں نے مضمون کی مناسبت سے "۔۔۔؟؟؟؟" سوالیہ علامت کی تکرار کو اس کا عنوان قرار دیا ہے۔ علی گڑھ میں ہر طالب علم کو اعزازی طور پر کوئی نہ کوئی عرفیت مرحمت فرمادی جاتی تھی۔ اس اداریے میں انھوں نے کسی مسعود صاحب کا ذکر کیا ہے جنھیں ٹامی کا خطاب دیا گیا تھا۔ آخر میں اس اداریے سے بھی ایک اقتباس دیکھتے چلیے۔ یہ ابواللیث صاحب کی ظرافت نگاری کی ایک عمدہ مثال ہے اور اس سے ہمارے دعوے کی تصدیق ہوتی ہے کہ ابواللیث صاحب اگر مزاح نگاری کی طرف توجہ دیتے تو ایک اعلیٰ درجے کے مزاح نگار ہوتے:

> "مسعود ٹامی نے ملازمت کے لیے درخواست دی، جن کے سامنے یہ درخواست پیش ہوئی، وہ زبان اور املاء کے معاملے میں کچھ ضرورت سے زیادہ ہی حساس تھے۔ مشہور ہے کہ ان کے صاحب زادے نے گھر کے رواج مقررہ کے مطابق والد صاحب قبلہ کی خدمت میں ایک درخواست پیش کی مجھے بائیسکل کی ضرورت ہے۔ قبلہ نے اس پر حکم صادر فرمادیا، درخواست نامنظور، سائیکل کو دوچرخی کہتے ہیں۔ مسعود ٹامی نے اپنی درخواست میں شوشوں اور نقطوں کے لگانے میں ذرا احتیاط کم کی تھی، درخواست نامنظور، نقطوں کو برمحل نہیں لگایا گیا۔ مسعود ٹامی کی شوخیِ گفتار، رفتار اور تحریر دیکھیے کہ اب جو تحریر لکھی تو اس میں ایک بھی نقطہ نہیں لگایا۔ البتہ آخر میں کئی سطروں میں نقطے لگادیے، عرض ہے کہ حسب ضرورت اس ذخیرے سے نقطے لے لیجیے۔"(۲۷)

ستمبر ۱۹۹۴ء کے شمارے میں ابواللیث صاحب کا آخری اداریہ شائع ہوا۔ اسی ماہ کی سات تاریخ کو ان کا انتقال ہوگیا اور ان کی تحریروں کا سلسلہ ہمیشہ کے لیے بند ہوگیا۔ وہ بلاشبہ اردو ادب کی ایک بڑی شخصیت تھے۔ ان کی کتابیں اب تقریباً نایاب ہیں۔ سوائے "لکھنؤ کا دبستانِ شاعری" ان کی کوئی کتاب آسانی سے دستیاب نہیں ہوتی۔ ان کی تخلیقی تحریروں میں ان کی خودنوشت "رفت و بود" کے علاوہ یہ ادبی اداریے ہی تبرک کے طور پر موجود ہیں جو ماہ نامہ "تہذیب" کراچی کی پرانی فائلوں میں بند پڑے ضائع ہو رہے ہیں۔ یہ اداریے تحقیق کے کئی پہلو جیسے کہ مزاح نگاری کی تاریخ و اسلوب، نظام تعلیم کی اصلاحات، تنقیدی رجحانات، نفاذِ اردو کی تحریکیں، اردو رسم الخط کے مباحث، علی گڑھ تحریک، پاکستانی ادب کا پس منظر اور بعض بڑی ادبی شخصیات کی زندگی کے پوشیدہ پہلوؤں کی نقاب کشائی میں معاون ہو سکتے ہیں۔ ابواللیث صاحب کی خودنوشت کو ایک عرصے بعد کتابی صورت میں شائع کر دیا گیا ہے۔ یہاں ان ادبی اداریوں کا اجمالی جائزہ اس لیے پیش کیا گیا ہے کہ ممکن ہے کسی محقق میں تحریک و تشویق پیدا ہو اور وہ ان تحریروں پر کام کر کے انھیں محفوظ کر لے۔ اس طرح اگر یہ کتابی صورت میں شائع نہ بھی ہو سکے تو کم از کم کسی یونیورسٹی میں مقالے کی صورت میں ضرور محفوظ ہو جائیں گے اور بہ وقتِ ضرورت طلباء ان سے استفادہ کر سکیں گے۔

حوالہ جات

۱۔ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر۔(ابتدائیہ)،ماہ نامہ "تہذیب" کراچی، جلد: ۱، شمارہ: ۱، جون ۱۹۸۳ء۔ ص ۶

۲۔ایضاً۔ جلد ۱، شمارہ ۹، فروری ۱۹۸۵ء۔ ص ۴

۳۔ایضاً۔ ص ۵

۴۔ایضاً۔ ص ۵۔۶

۵۔ایضاً۔ جلد ۱، شمارہ ۸، ۷۔ دسمبر ۱۹۸۳ء۔ ص ۷

۶۔ایضاً۔ جلد ۱۲، شمارہ ۲، جولائی ۱۹۹۴ء۔ ص ۵۔۶

۷۔ایضاً۔ جلد ۲، شمارہ ۸، جنوری ۱۹۸۵ء۔ ص ۴

۸۔ایضاً۔ جلد ۷، شمارہ ۴، ستمبر ۱۹۸۹ء۔ ص ۴

۹۔ایضاً۔ جلد ۷، شمارہ ۱، جون ۱۹۸۹ء۔ ص ۶

۱۰۔ایضاً۔ جلد ۴، شمارہ ۷، دسمبر ۱۹۸۶ء۔ ص ۵

۱۱۔ایضاً۔ جلد ۶، شمارہ ۵، اکتوبر ۱۹۸۸ء۔ ص ۷

۱۲۔ایضاً۔ جلد ۱۱، شمارہ ۴، اپریل ۱۹۸۷ء۔ ص ۴۔۵

۱۳۔ایضاً۔ جلد ۵، شمارہ ۱۰، مارچ ۱۹۸۸ء۔ ص ۴

۱۴۔ایضاً۔ جلد ۶، شمارہ ۱۱، اپریل ۱۹۸۹ء۔ ص ۵۔۶

۱۵۔ایضاً۔ "کیسے کیسے لوگ"، جلد ۱۰، شمارہ ۱، جون ۱۹۹۲ء۔ ص ۴

۱۶۔ایضاً۔ جلد ۵ شمارہ ۶، اکتوبر ۱۹۸۸ء۔ ص ۷

۱۷۔ایضاً۔ جلد ۶، شمارہ ۱، جون ۱۹۸۹ء۔ ص ۳

۱۸۔ایضاً

۱۹۔ایضاً

۲۰۔ایضاً۔ "قدر دانیِ عالمِ بالا معلوم شد"، جلد ۹ شمارہ ۷، دسمبر ۱۹۹۱ء۔ ص ۳

۲۱۔ایضاً۔ "ادبی خرکار"، جلد ۱۰، شمارہ ۱۱، اپریل ۱۹۹۳ء۔ ص ۳۔۴

۲۲۔ایضاً۔ جلد: ۷، شمارہ ۵، اکتوبر ۱۹۸۹ء۔ ص ۶

۲۳۔ایضاً۔"مسئلہ کیا ہے؟"، جلد:۹، شمارہ۹، فروری ۱۹۹۲ء۔ص ۳

۲۴۔ایضاً۔"ہٹ یارٹ"، جلد:۸، شمارہ ۱۲، امئی ۱۹۹۱ء۔ص ۳

۲۵۔ایضاً۔"گدھوں کی تعداد میں اضافہ"، جلد: ۱۲، شمارہ ۲، اجولائی ۱۹۹۴ء۔ص ۵

۲۶۔ایضاً۔"کچھ عطائی طبیبوں کے باب میں"، جلد:۸، شمارہ ۳، اگست ۱۹۹۰ء۔ص ۷

۲۷۔ایضاً۔جلد ۸، شمارہ ۲، جولائی ۱۹۹۰ء۔ص ۴

تعلیقے

I۔جامعہ کراچی، شعبہ اردو کی ایک طالبہ سعدیہ قریشی نے، شعبے کی ایک استاد محترمہ سہیلا فاروقی کی نگرانی میں سال ۲۰۰۷ میں، اس سوانح کو ایم اے اردو کے لیے مرتب کیا تھا مگر اس مقالے میں چند اقساط شامل نہیں ہیں اور کتابت کی اغلاط کی بھرمار ہے۔

II۔عقیل صاحب کے مرتبہ مطبوعہ نسخے میں بھی کل اقساط شامل نہیں ہیں۔

III۔یہاں ابواللیث صاحب نے ڈاکٹر وحید قریشی پر طنز کیا ہے جن سے ان کے تعلقات کشیدہ تھے۔اپنی "تاریخِ زبان وادبِ اردو" کے صفحہ ۱۱ پر انھوں نے وحید قریشی کے بارے میں اپنی رائے دیتے ہوئے لکھا ہے کہ: "سید صاحب (سید عبداللہ) کے ایک شاگرد ڈاکٹر وحید قریشی ہیں۔ان کی اصل شہرت ان کے دو کتابچوں 'شبلی اور عطیہ کی داستانِ معاشقہ' اور 'اقبال اور عطیہ کے خطوط'، سے ہوئی ہے۔وہ بھی فارسی کے استاد تھے اور ان کا پی ایچ ڈی کا مقالہ بھی فارسی پر ہے۔بعد میں انھوں نے میر حسنؔ پر ایک کتاب لکھ کر ڈی لٹ حاصل کی۔پی ایچ ڈی کا مقالہ شائع نہیں ہوا، نہ اس کا کوئی نسخہ پنجاب یونیورسٹی میں دستیاب ہے۔میر حسنؔ کے صرف چند نسخے شائع ہوئے تھے اور وہ بھی اب نایاب۔جو لوگ ان کو نقاد تسلیم کرتے ہیں، وہ لکھتے ہیں کہ ان کو دوسروں کی ٹوپی اچھالنے میں مزہ آتا ہے۔یہی ان کی تنقید کی خصوصیت ہے۔

IV۔یہاں بھی روے سخن وحید قریشی ہی کی طرف ہے۔

V۔اپنی "تاریخِ زبان وادبِ اردو" کے صفحہ ۷۰۰۔۷۰۱ پر ابواللیث صاحب نے اطلاع دی ہے کہ یہ مضمون جو "مصر کے لیڈر" کے عنوان سے شائع ہوا، اقبال احمد سہیل نے لکھا تھا جن کا ذکر رشید احمد صدیقی نے بھی اپنی تحریروں میں کیا ہے۔

VI۔اگرچہ "ہجو" بھی قصیدے ہی کا ایک پہلو ہے لیکن قصیدے سے اردو کے عام طالب علم "مدح" میں لکھی گئی نظم مراد لیتے ہیں۔یہاں ابواللیث صاحب نے سوداؔ کے جس قصیدے کا ذکر کیا ہے وہ ایک مثنوی بہ عنوان "مثنوی در ہجو شیدی فولاد خان کوتوال شاہ جہاں آباد" ہے۔اس میں سوداؔ نے ایک رشوت خور کوتوال کا حال بیان کیا ہے جو چوروں سے رشوت لیتا ہے۔حتا کہ اس کے نوکر، خدمت گار تک چور اور اٹھائی گیرے ہیں۔ایک دن اس نے طنزاً اپنے خادموں سے کہا کہ اگر تم میری کوئی چیز چراؤ تو بازار میں اونے پونے بیچنے کی بجاے اس کی مقررہ قیمت مجھ ہی سے لے لینا۔متعلقہ اشعار یہ ہیں:

ایک دن اس نے سب سے طنز کی راہ — کہا تم ہو مرے نپٹ دل خواہ

چیز میری جواب چراؤ تم — چوک میں بیچنے نہ جاؤ تم

قیمت اس کی جو کچھ مشخص ہو — اتنے کو تم اسے مجھی کو دو

ایک ان میں سے یہ سخن سن کر — لگا کہنے کہ اس سے کیا بہتر

کیا جب آپ تم نے یہ انصاف — میں یہ کرتا ہوں عرض رکھیے معاف

آپ کے سر پہ یہ جو پگڑی ہے — دو خریدار اس کے ہیں در پے

دس روپے وہ مجھے دلاتے ہیں — کہیے اب آپ کیا لگاتے ہیں۔

VII۔ابواللیث صاحب کی "تاریخِ زبان وادبِ اردو" ۱۹۹۸ میں رہبر پبلی کیشنز، کراچی نے تقریباً ۱۲۶۸ صفحات کی ضخامت میں شائع کی۔ یہ ادبی تاریخ بھی ابواللیث صاحب کی دیگر کتابوں کی طرح نایاب بل کہ ناپید ہے۔ حتیٰ کہ اردو زبان وادب کے اکثر اساتذہ و طلبا اس بات سے بے خبر پائے گئے ہیں کہ ابواللیث صاحب نے کوئی ادبی تاریخ بھی لکھی تھی۔